بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر)۔ مگر حضرت زید نے اس حکم نبوی کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینب کو طلاق دے دی۔ اس فعل کے خلاف حکم ہونے میں تو کوئی شبہہ نہیں اور قرآن کے انداز بیان میں صراحتہً یا کنایتہً ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید کی اس سرتابی کو کسی ادنیٰ درجہ میں بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیان واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر بِالَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس پر اللہ نے انعام کیا) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے، اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہو جائے کہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی اس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے۔"

سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں، چند لفظوں میں شبہہ کو رفع کیا جا سکتا تھا لیکن دراصل یہ شبہہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہاں متعدد غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دور تک پہنچا ہوا ہے، اسلئے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اصل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیے جائیں۔

قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ صرف اسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ۔ اطاعت در اصل اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور صرف اسی کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ اس کے سوا انسان نہ کسی کا مخلوق ہے، نہ مربوب ہے، نہ بندہ ہے، اس لیے فی الاصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیت مطلقہ حاصل ہے، اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ وہ اس خاص شخص کا حکم ہے۔

قرآن کے نزول کا اصلی مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور مطاع حقیقی کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے۔ اور اس کے امر و نہی کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لئے بمنزلہ خدا ہے اس قسم کی اطاعت اور

حکومت کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے، اور جو لوگ اپنے احبار و رہبان اور مذہبی پیشواؤں اور دنیوی حاکموں کو ارباباً من دون اللہ بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھیراتا ہے، کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کریگا، تو لامحالہ اس کی تہ میں الوہیت کا تصور اور عبودیت کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلیۃً دست بردار ہوتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بری اور عیوب و نقائص سے منزہ اور جزو کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ بالذات امر و نہی کا مالک ہے اور اسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے، اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے؟ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران، یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے، اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو امر و نہی اور تحلیل و تحریم کا ذاتی حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ نبی خود بھی ارباباً من دون اللہ میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں اس کا مقصد بعثت فوت ہو کر رہے گا۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا۔ وَقَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ "حکم" بھی عطا ہوتا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ "حکم" کے مفہوم میں قوت فیصلہ اور اقتدار حکومت (اتھارٹی) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو اقتدار حاصل ہے وہ خدا کا دیا ہوا اقتدار ہے، اس لیے اس کی اطاعت دراصل خدا ہی کی اطاعت ہے مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ وہ بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے تم پر حکومت کرے اور تم اس کی اطاعت کرو۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون وچرا کرنے کا حق نہیں۔ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی و یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا عمل تو درکنار اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آجائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما اور اس نافرمانی کا نتیجہ ابدی خسران ونامرادی ہے یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا یہ طاعت اور کامل سپردگی جس پر دین وایمان کا مدار رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق صاف کہدیا گیا ہے کہ ہدایت بالکلیہ نبی کی اطاعت پر منحصر ہے (وان تطیعوہ تھتدوا) اس کا مرجع نبی کی شخصی بشری حیثیت نہیں ہے کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنائے، بلکہ اس لیے بھیجا کہ وہ ان کو خدا کا تابع فرمان بنائے۔ ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی پر مجبور کرے اور اپنی شخصی عظمت وبزرگی کا سکہ ان پر جمائے اور ان کو اپنے شخصی اقتدار کے شکنجہ میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلہ میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دست بردار ہو جائیں، اور اپنے دل اور دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہے جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا جاتا ہے۔ انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی تو نبی کی بعثت کا مقصود ہے

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ انسان نے حلال و حرام کی من مانی حدیں مقرر کرنے کے جن اختیارات پر قبضہ کر لیا تھا ان کو سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ۔ انسانی حکم اور انسانی فیصلہ کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوت قائم کی جاتی ہے۔ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی ان کی گردن سے دوسروں کا طوق اتار کر اپنا طوق ڈالدے اور تحلیل و تحریم کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں کر لے اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جائے۔ اس نے تو یہود و نصاریٰ کو اسی پر ملامت کی تھی کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ پھر وہ کیسے کہتا کہ اب تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو رب بنا لو اور میری خواہشات نفس کی پابندی کرو؟

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ اطاعت مفروضہ جو اصل ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سر مو انحراف کا بھی حق نہیں، وہ دراصل ذات نبویہ کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس فیصلہ کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی خود اللہ سے حاصل کر کے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے اور اس اعتبار سے اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء: ۱۶) اے نبی ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس حق و صواب کے مطابق

فیصلہ کرو جو اللہ تم کو سمجھا دے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (المائدہ : ۷) — اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (الانعام : ۵) — میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی ہے؛ اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبی کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو "حکم" عطا کیا گیا ہے۔ حکام کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسول کے امر و نہی اور ان کے مقرر کیے ہوئے حدود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے، وہ اس میں ہرگز کوئی چون و چرا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی حریت فکر اور آزادی رائے حاصل نہیں۔ لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے، تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور ائمہ اور حکام تو درکنار، خود رسول خدا کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ انسان کی گردن میں ڈالدیں۔ اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اس کی گردن سے اتار پھینکیں یہ دونوں کام آپ کے مقصد بعثت میں شامل تھے اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں کیونکہ آپکی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین فرما دیں کہ کسی انسان کی حتّٰی کہ خود آپ کی حیثیتِ انسانیہ کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے، اور ان کی روحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیتِ نبوّت اور حیثیت بشریت دونوں جمع تھیں اور ان کو کسی واضح خط امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ کے رسول پاک نے اللہ کی بخشی ہوی حکمت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا۔ آپ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخ عالم میں کبھی کسی امیر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے جان نثار متبعین کو ایسی آزادی رائے عطا کی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ بلکہ سچ یوں ہے کہ آپ نے جس طرح اپنے پیروؤں میں حریت فکر کی روح پھونکی' اور جس طرح صحیح جمہوری اصول پر ان کی تربیت فرمائی اور جس طرح خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں اُن کی ہمت افزائی کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل اپنی حیثیتِ انسانی میں بھی آپ جو کچھ کرتے تھے وہ بعینہٖ آپ کی حیثیتِ نبوی کے ماتحت ہوتا تھا۔ یا بالفاظ دیگر یہ بھی آپکے فرائض نبوت کا ایک شعبہ تھا کہ آپ کچھ امور حیثیت انسانی میں انجام دیکر لوگوں کو سکھائیں کہ انسان کے مقابلہ میں انکو اس طرح آزادی استعمال کرنی چاہیے اور انھیں بتائیں کہ اس آزادی کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے حتّٰی کہ اُس انسان کامل'

اُس عظیم الشان شخصیت کے مقابلہ میں بھی جس سے بڑی شخصیت نہ دنیا میں کبھی پیدا ہوئی نہ کبھی پیدا ہوگی

حضور فرماتے ہیں کہ :-

اِنَّمَا انا بشرٌ اذا امرتکم بشیءٍ مِن دینکم فخذوا بہٖ واذا امرتکم بشیءٍ من رائی فانما انا بشرٌ	میں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تمکو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اُسے مانو۔ اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

ایک مرتبہ حضور نے کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا اور وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپ سے عرض کیا گیا تو فرمایا:

اِنی انما ظننت ظنًا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئًا فخذوا بہٖ فانی لم اکذب علی اللہ۔	میں نے تو اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری اُن باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ لیکن جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضور ابتدا میں جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ مناسب نہ تھی۔ حضرت حباب بن منذر نے آپ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کی بنا پر کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کر فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے۔ حضور نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیران بدر کے مسئلہ میں حضور نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکن جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمر نے آپ کی اور صدیق اکبر کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ اسی مجلس میں حضور نے خود اپنے داماد ابو العاص کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر

تمہاری مرضی ہو تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انھیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہ نے بخوشی اس کی اجازت دی تب آپ نے ہار انھیں واپس دیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر حضور نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجال کلام نہیں۔ اور اگر حضور اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضور نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلحنامہ کا مسودہ چاک کر ڈالا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمر نے علانیہ اس سے اختلاف کیا۔ مگر جب حضور نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجودیکہ غیرت اسلامی کی بنا پر سب ملول تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ آپ نے ایک ایسے امر میں حضور سے اختلاف کیا جو بحیثیت رسول کیا جا رہا تھا۔

جنگ حنین کے موقع پر تقسیم غنائم میں آپ نے مولفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چین بجبیں ہوئے۔ حضور نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو چاہوں کروں۔ بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے۔ ان کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انھیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضور کی تصریح سے صحابہ کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہار رائے کرتے تھے، اور آپ خود اس آزادانہ اظہار رائے میں ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے

ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا، بلکہ آپ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپ خود بسا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔

اب حضرت زید کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضور کے ساتھ ان کا تعلق صرف نبی اور اُمتی ہی کا نہ تھا۔ بلکہ ایک تعلق یہ بھی تھا کہ آپ ان کے برادرِ نسبتی تھے اور وہ آپ کے بہنوئی تھے۔ اور ایک تعلق یہ بھی تھا کہ آپ اُن کے مربی تھے۔ اور وہ آپ کے پروردہ تھے۔ بیوی سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ان کو وہی مشورہ دیا جو ہر برادرِ نسبتی اپنے بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دیگا۔ یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بنا پر زوجین میں تنافر تھا اس کو حضرت زید خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و اعتقاد کا نہیں بلکہ ان کے حیاتِ نفس کا تھا اس لیے انہوں نے حضور کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسولِ خدا کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضور نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسول خدا کی حیثیت سے تھا۔ اس لئے نہ آپ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضور کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن سے پالا ہو اور اس پر احسانات کئے ہوں اور آخر میں غلامی سے دامن دار ہونے کے باوجود خود اپنی بہن سے اس کی شادی کی ہو، اور پھر اس نے باوجود منع کرنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا۔ مگر حضور صرف مربی اور صرف برادرِ نسبتی ہی نہ تھے بلکہ رسول خدا بھی تھے، اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلوائیں، اس لیے آپ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی ذات میں حیثیت

نبوی اور حیثیت بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے۔ حیثیت بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض بھی اسی کے ضمن میں ادا ہو جاتے تھے۔

سرکارِ رسالت مآب نے جس حریتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکام الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادی رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھایا تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام تمام انسانوں سے زیادہ احکام الٰہی کے اطاعت کیش، اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں جو بڑے آدمی تھے، جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادی رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں اس کو نہ صرف گوارا کیا، بلکہ اس کی ہمت افزائی کی، اور کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں، اس لیے ہماری بات کو بے چون و چرا تسلیم کرو۔

خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس نے اس حریتِ فکر کو تخویف اور اطماع، ظلم و ستم اور زر پاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی مگر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے

بعد بھی ایک مدت تک یہ روح مسلمانوں میں باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ امراء اور حکام کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتہً ایک چھوٹی چیز ہے۔ روح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے جس کی عزت و عظمت اس کے پنہائے قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے، اور اس کے مقابلہ میں بھی آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی اسپرٹ ہم کو اس دور کے اہل علم میں نظر آتی ہے جو صحابۂ کرام سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی۔ اور حضرات تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہوگا۔ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابۂ کرام کی آراء پر نقد کرتے تھے ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے کو قبول کرتے تھے۔ اختلاف صحابہ میں امام مالک کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خطأ وصواب فانظر فی ذالک۔ "ان کی آراء میں خطا بھی ہے اور صواب بھی۔ تم خود غور کر کے رائے قائم کرو" اسی طرح امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے احد القولین خطأ والمأثم فیہ موضوع۔ "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہرحال غلط ہوگا"۔

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکر صدیق جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے کہ ھذا رائی فان یکن صوابًا فمن اللہ وان یکن خطأً فمنی واستغفر اللہ۔ "یہ میری رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اگر غلط ہے تو میری خطا ہے۔ اور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں"۔

حضرت عمر فرماتے ہیں۔ لا تجعلوا خطأ الرأی سنۃ لائمۃ۔ "رائے کی غلطی

کو امت کے لیے سنت نہ بنا لو"۔

حضرت ابن مسعود کا قول ہے الا لا یقلدن احدکم دینہ رجلا ان امن امن و ان کفر کفر فانہ لا اسوۃ فی الشر۔ "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن رہا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے"۔

امام مالک فرماتے ہیں۔ انما انا بشر اخطی و اُصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔ "میں ایک انسان ہوں میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے میں نظر کرو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ اسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو"۔ امام مالک ہی کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی انکی کتاب الموطا، کو تمام عالم اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کر کے صرف مذہب مالکی کو رائج کر دے مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق اور ازادی رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں لا یحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا "کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہو تا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے"

امام شافعی فرماتے ہیں مثل الذی یطلب العلم بلا حجۃ کمثل حاطب لیل یحمل حزمۃ حطب وفیہ افعی تلدغہ وھو لا یدری۔ "جو شخص حجت کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چن رہا ہے۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاتا ہے

اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اس کو ڈس لے گا۔"

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریت فکر و نظر اور آزادانہ طلبِ حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امراء و حکام اور علماء و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا، درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ دل اور دماغ کی غلامی، فکر اور نظر کی غلامی، روح اور جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا۔ جب غیر اللہ کے سامنے تابڑ توڑ سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھانا بھی سوءِ ادب ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان انسان کا خداوند اور مالک اور آقا بن جائے، جب انسان بذاتِ خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ و سنت رسول کے انتقاد سے بری قرار دیا جائے، جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے عملاً نہ سہی علماً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے ساتھ دی گئی تھی اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی، عمرانی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔